

شان الحق حقّی

خود نوشت (کشاکش روزگار)

میں نے ملازمت ۱۹۴۰ء میں شملے پر مانٹرنگ آفس سے شروع کی تھی جس کا کچھ ذکر آگے آئے گا۔ پھر دو ڈھائی مہینے بعد ہی ایک مترجم کی جگہ فوجی ہیڈکوارٹرز میں نکلی جہاں تنخواہ دگنی تھی، اور میں اس کے لیے منتخب ہو گیا۔ اس دفتر میں ذوالفقار علی بخاری صاحب بھی بی بی سی جانے سے پہلے کام کر چکے تھے۔ میرے سامنے بھی ذہین لوگوں کی ایک مختصر سی جماعت وہاں تھی۔ ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی، شفیع منصور، جن کا مجموعہ کلام "غم رائیگاں" حال ہی میں چھپا ہے، مشتاق احمد (سابق وزیر خزانہ شعیب صاحب کے بھائی)، محمد علی (پروفیسر احمد علی کے چھوٹے بھائی)، اور ان سب کی جان سے دور، شریف الحسن مرحوم۔ کپتان جڈ (Judd) صاحب ہمارے افسر شعبہ تھے، اور ہم سب ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ خاصا کلاس روم کا سا سماں ہوتا تھا۔ ہمارا کام تھا فوجیوں کی تربیت کے لیے ٹیکنیکل لٹریچر کا اردو میں ترجمہ کرنا۔ رسم الخط رومن ہوتا تھا، اردو نہایت سلیس، اور اصطلاحی الفاظ عموماً انگریزی۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس شعبے کی بدولت علوم عسکری پر کتنا لٹریچر اردو میں پیدا ہو چکا ہے، اگرچہ یہ عام اشاعت کے لیے نہیں ہے۔

جڈ صاحب جن کو میں نے اپنی ایک کہانی "خیرو کباری" (مطبوعہ "ماہ نو"، ستمبر ۱۹۸۱ء) میں افسانوی کردار کے طور پر متعارف کرایا ہے، ایک نہایت دلچسپ اور سچ مچ کی شخصیت تھے۔ اردودانی میں طاق اور ترجمے میں

ہمارے کان کاٹتے تھے۔ وہ ہمارے کیے ہوئے ترجموں پر ہاتھ کے ہاتھ اصلاح کرتے جاتے تھے۔ دن بھر کا کام ان کو پیش ہوتا تھا اور وہ اس پر بے تکان قلم چلاتے تھے، ایسا کہ ہمیں مانے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ تم لوگوں کے قلم میں ادبیت آ جاتی ہے۔ ہمیں رنگروٹوں کے لیے بالکل سیدھی سادی، سہل ترین عبارت چاہیے۔ چنانچہ ایک جملے کو دو تین جملوں میں توڑ دیتے اور کہتے دیکھو اب بات اس رنگروٹ کے پلے پڑے گی۔ سچ ہے کہ سہل نگاری بڑا مشکل کام ہے۔

جد صاحب نے تیس برس بڑی محنت اور لگن سے اردو سیکھی تھی۔ اُن کا معمول تھا کہ روزانہ ایک گھنٹہ (فیس دے کر) اردو کے کسی ایسے استاد کے ساتھ گزارتے جسے انگریزی بالکل نہ آتی ہو۔ دلی میں استاد بیخود سے صحبت گرم رہتی تھی۔ مولوی عبد الحق صاحب سے بھی اچھی ملاقات تھی اور انہوں نے اُن کو انجمن کی مجلسِ اعلیٰ میں بھی شریک کر لیا تھا۔ ہم اہلِ عملہ کو بھی اُن کی ہدایت تھی کہ میرے سامنے "اردوئے مبروص" نہ بولا کرو۔ خالص اردو ہو یا خالص انگریزی۔ محاورات اور امثال کی بیاضیں بنا رکھی تھیں، جو نیا لفظ یا محاورہ سننے میں آتا، بیاض میں ٹانک لیتے۔ "مغلظات" سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس کے بغیر زبان دانی کا حق ادا نہیں ہوسکتا، ناقص ٹھہرے گی۔ چنانچہ مغلظات کی بیاض الگ تھی۔ کوئی نئی گالی سنتے تو پھرک جاتے۔ کوئی نیا محاورہ سن لیتے تو اسے برتنے کے لیے موقعے کی تلاش میں رہتے۔ کہاں بولوں، کیسے برتوں۔ ایک دن کسی کام سے کسی دوسرے فوجی شعبے میں گئے۔ وقت بہت ضائع ہوا، خاصی کھکھیڑ بھی اُٹھائی اور کام نہ بن سکا۔ واپس آکر فائل میز پر پٹکا اور کہا، "لو اتنے کی کمائی نہ ہوئی جتنے کا لہنگا پھٹ گیا۔" دراصل کمائی کی جگہ انہوں نے ایک اور ہی ٹھیٹ لفظ بولا تھا جسے میں دُہرا نہیں سکتا۔

جنگ کا ابتدائی زمانہ تھا، فضا خوش گوار نہ تھی۔ جنرل ہیڈکوارٹرز کے شعبوں میں کام کا زور رہتا۔ ہم بھی اپنے کام میں جُتے رہتے کہ بھرتی دھڑا دھڑا ہو رہی تھی اور فوجی تربیت کے سلسلے کا نیا لٹریچر آتا رہتا تھا۔ جد صاحب نے دیکھا کہ صبح سے لوگ گردن جھکائے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کمرے پر بے کیفی طاری ہے۔ ایسے میں کوئی پھرکتی ہوئی بات ہونی چاہیے کہ انتقباض رفع ہو۔

فرمایا، "قدرت اللہ، بھئی وہ کیا کہتے ہیں، بلی کے خواب میں —؟" قدرت اللہ صاحب نے کہا، "جی، چھچھڑے ہی چھچھڑے۔" بولے، ہاں، اور رنڈی کے خواب میں —؟" اس کا جواب جو انھوں نے خود ہی اچھل کر دیا، دہرانے کے قابل نہیں۔ انھوں نے شاید چھچھڑے کے ساتھ قافیہ ملانا چاہا تھا، مگر انگریزوں کی حس قافیہ کے معاملے میں زیادہ ذکی نہیں ہوتی۔ ایٹا کو نہیں گردانتے، نہ حرفِ ردی کو پہچانتے ہیں۔ جد صاحب اپنی اردو دانی کے باوصف شاعری سے چنداں بہرہ ور نہ تھے۔ ان کی بیوی ایک جاپانی خاتون تھیں، لیکن جاپانی زبان سے جد صاحب نے کسے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً سیکھی بھی نہیں۔

اپنے ایک سابقہ پھیرے میں رالف رسل صاحب نے بتایا کہ جد صاحب انتقال کر گئے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ان کی بیاضیں تلف نہیں ہونی چاہئیں، اور انھوں نے خود بھی ان سے دلچسپی ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ بیاضوں کا پتہ چلائیں گے۔ پھر نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔

ایک دن میں خاصی طرح کام کر رہا تھا کہ ہمارے افسرِ اعلیٰ کرنل بیئرڈ نے بلایا۔ جد صاحب اس دن غیر حاضر تھے۔ کرنل صاحب نے کہا، "افسوس ہے مجھے تم کو علیحدہ کردینے کے احکامات پہنچے ہیں۔" میں نے کہا اس کا سبب؟ تو بولے کہ اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ تم ابھی مستقل نہیں ہوئے تھے۔ مگر سبب ظاہر تھا۔ میرے کام کی بابت تو پسندیدگی کا اظہار کیا جا چکا تھا۔ والد صاحب نے ظفر عمر صاحب (مصنف "نیلی چھتری"، وغیرہ؛ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے خسر) سے ذکر کیا جو ان کے پرانے دوست تھے اور انڈین پولیس کے ڈی اٹر افسر رہے تھے۔ انھوں نے میرا کچا چٹھا علی گڑھ کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ سے معلوم کیا جس کی رپورٹ پر انٹیلی جنس بیورو نے مجھے خطرناک دشمن سرکار اور ملازمت کے ناقابل بتایا تھا۔ اس سے بڑے دلچسپ انکشافات ہوئے:

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا
(رسوا)

ویسے عمر ہی اس وقت کتنی تھی، مگر معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے طلبہ پر برطانوی حکومت کیسی کڑی نظر رکھتی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں کچھ فرشتے موجود رہتے تھے جو ہمیں میں سے ہوں گے۔ ہم کونسی ہم سازی کرتے تھے۔ لے دے کے کچھ باتیں ہی بنا لیتے تھے تو لڑکیں میں زبان کو لگام کون دے سکتا ہے۔ بس کچھ بک جھک لیتے تھے، سو وہ نامہ اعمال میں لکھا گیا۔ علی گڑھ سے کوئی بارہ پندرہ میل دور بردوا گنج میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ ہندوستان بھر سے لیڈر جمع ہوئے۔ بہت سے لڑکے بھی جا پہنچے۔ ان میں ہم بھی تھے۔ ایم۔ این۔ رائے کے خیمے میں بھی بیٹھے۔ انہیں یونین ہال میں لیکچر کی دعوت دے دی۔ ان دنوں صدیق احمد صدیقی یونین کے سیکرٹری تھے، اور میں کینٹ کا ممبر اور لائبریرین تھا۔ ہم نے سوچا شاید یونیورسٹی والے ایم۔ این۔ رائے کی کتاب "ہسٹاریکل رول آف اسلام" کا کچھ لحاظ کریں جس کا ان دنوں خاصا چرچا تھا، مگر اجازت نہ ملی۔ وہ صرف ڈاکٹر علیم کے مکان تک آنے پائے جہاں طالب علموں کا ایک جمگھٹا ان سے ملا۔ (---)

ذکر میرے نامہ اعمال کا تھا۔ ایک دفعہ لڑکوں میں تحریک ہوئی کہ یونیفارم کھڈر کی ہونی چاہیے۔ سیاہ سرج کی شیروانی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس محضر پر خاکسار کے دستخط بھی تھے اور وہ بھی سی۔ آئی۔ ڈی۔ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ گویا جتنوں کے دستخط اس پر تھے سب معتبہ ٹھہرے۔ جنگ کا زمانہ تھا اور فوج میں برابر بھرتی ہو رہی تھی۔ ادھر فرقہ وارانہ عصبیت زوروں پر تھی۔ پولیس والوں کی کوشش رہتی تھی کہ دوسرے دھرم کا کوئی آدمی جہاں تک ہوسکے کاٹ دیا جائے۔ علی گڑھ خاص طور پر معتبہ تھا۔ تاہم ظفر عمر صاحب کہتے تھے کہ ایک کھلا کارڈ بھی مجھے ڈال دیتے کہ چال چلی کی تصدیق کے لیے نام گیا ہے تو میں سب الزام دھلوا دیتا۔ آخر انہوں نے اختر حسین رائے پوری کا نامہ اعمال دھلوا ہی دیا تھا اور وہ محکمہ تعلیم میں تعینت ہو گئے تھے۔ عرصے بعد ۱۹۲۶ میں جب میں کلکتے میں تھا تو ایک صاحب مجھے

ڈھونڈتے ہوئے آئے اور پوچھ گچھ کی۔ میں نے مطلب پوچھا تو کہا، شاید آپ نے کسی سرکاری ملازمت کے لیے درخواست دی ہوگی۔ یہ انکوائری دہلی سے آئی ہے۔ میں نے سرگزشت بیان کی تو بات ان کی سمجھ میں آئی کہ موجودہ مشاغل کی بابت اوپر سے استفسار ہوا ہے۔ اس وقت تو مذہبی عصبیت اور بھی زوروں

پر تھی، اور یہ صاحب اتفاق سے مسلمان تھے۔ اپ کا جذبہ اخوت جوش میں آیا اور انہوں نے کہا، آپ مطمئن رہیں، میں بڑی اچھی رپورٹ بھیجوں گا، حالانکہ ان دنوں شرماجی کے توسط سے میری ریڈیکل لوگوں سے اچھی یاد اللہ تھی۔ شملے ہی سے "پیپلز ایج" کا خریدار بھی تھا۔ انہی نے مجھے تلقین کی تھی کہ ووٹ مسلم لیگ کو دینا۔

جنرل ہیڈکوارٹرز سے نکلنے کے بعد میں کچھ عرصے بیکار رہ کر پھر مائٹرنک آفس میں گھس گیا تھا جہاں پہلے کام کر چکا تھا۔ کام مشکل اور مہارت طلب تھا اور تنخواہ نہایت قلیل، صرف پچاسی روپے۔ ان لوگوں کو اچھے آدمی نہیں مل رہے تھے۔ روزانہ دو بیرونی نشریات کا انگریزی میں حرف بحرف ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ قلم برداشتہ، ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر۔ تاکید تھی کہ گالیاں بھی چھوٹنے نہ پائیں۔ "ہمالیہ ریڈیو" والے سردار جی تو دل کھول کے مغفلات سناتے تھے۔ کسی کی پشت پر "اوم کا جھنڈا" گارنے کا ذکر کرتے تھے تو کسی کے اعضائے جسمانی کو حوض وغیرہ میں تبدیل کرنے کا۔ خبروں کا بلیٹن اتنا درد سر نہ تھا جتنا کہ ان پر تبصرے اور تقریریں جو برلن، روم، جکارتا، ٹوکیو اور کہاں کہاں سے آتی تھیں۔ ریکارڈ بھر لیے جاتے اور ہم ہیڈفون لگائے ٹائپ رائٹر پر کھٹا کھٹ ترجمہ کرتے جاتے۔ صبح سے پہلے کام ختم کرنا لازمی تھا۔ پہاڑ کے کرکراتے جاڑوں میں تمام رات دفتر میں بیٹروں کے درمیان بیٹھے گزرتی۔ ۱۹۴۴ میں شملے پر اتنی برف باری ہوئی کہ ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ چند روز کے اندر گیارہ فٹ برف! چھتیس بیٹھ گئیں۔ ریلوے کا سائبان آن پڑا۔ مال روڈ ایک طویل قد آدم پلیٹ فارم بن گیا تھا۔ پانی کے نل پھٹ گئے۔ کوئلہ نایاب، مزدور فرار، عجیب دن گزرے۔

ایک دن بابو میلا رام سپرنٹنڈنٹ نے چپکے سے کان میں کہا استعفا دے کر چلے جاؤ۔ تمہارا نام گرٹ میں آگیا ہے اور ہمارے پاس نقل پہنچ گئی ہے۔ یہاں اب تم نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ہم نے استعفا دے دیا۔

کچھ دن بعد جذبی نے لکھا کہ میں "آجکل" سے جا رہا ہوں۔ تمہیں یہاں رکھوائے دیتا ہوں، فوراً چلے آؤ۔ اب ہم "آجکل" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو کر چپک گئے۔ آغا محمد یعقوب دواشی ایڈیٹر تھے اور مجھ پر بے حد مہربان۔ وہ انگریزی اچھی لکھتے تھے۔ یہاں "ڈان" اخبار میں بھی لیڈ رائٹر رہے مگر ان کے انگریزی مضامین اردو میں ترجمہ ہو کر چھپتے تھے جو میں کرتا تھا۔ یہ دفتر

بھی سرکاری تھا، میں نے چھ پرچے اس رسالے کے مرتب کیے تھے کہ افسر انتظامی فرید صاحب نے بلایا۔ وہ میری بے قاعدہ بھرتی پر خاصے پریشان تھے۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ چپکے سے استعفا دے کر چلے جاؤ کہ ہماری بھی جان چھوٹے اور تمھاری بھی۔ آغا صاحب بے حد آزرده ہوئے، واقعی رونکھے ہو گئے کہ یہ کیا علت تمھارے پیچھے لگی ہوئی ہے، مگر اس کاٹے کا منتر ہی نہیں تھا۔ بعد میں وہاں اس جگہ پر وقار عظیم آئے۔

شملة کے مانٹرننگ آفس کے انچارج ایک صاحب تھے مسٹر سب تھارپ (Sibthorpe)۔ یہ مشہور روزنامہ "ہندو" مدراس، کے ایڈیٹر تھے۔ یہ بھی جنگ کے دوران جبری بھرتی میں آگئے تھے اور مانٹرننگ آفیسر مقرر کر دیے گئے تھے۔ اب سنیے کہ میں "اجکل" سے نکلا تو ایک دن شملے سے مانٹرننگ آفسر کا تار آگیا کہ فوراً پہنچو۔ ان کو عملے کے کسی آدمی نے بتایا تھا کہ میں فارغ ہوں۔ میرا کیا بگڑتا تھا، پہنچ گیا۔ میلا رام نے بتایا کہ وہ تمھیں یاد کرتے تھے۔ میں نہ کہا ان کی بابت تو یہ نوٹیفکیشن ہے، تو بولے "ناں سنس، آئی نیڈ ہم پیر"۔ عمر بھر کے جرنلسٹ تھے اور دھڑلے کے ایڈیٹر۔ سرکاری ضوابط سے یا تو بے خبر تھے یا خاطر میں نہیں لائے۔ میلا رام کے اونچ نیچ سمجھانے کے باوجود تار دلوا دیا۔ انھوں نے غالباً ہوم ڈپارٹمنٹ کو لکھا کہ یہ لڑکا یہاں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں اسے رکھنا چاہتا ہوں، مگر ان کی نہیں چلی۔ میں پھر الگ ہو گیا۔

شملة پر ہندوستان کی سات بڑی بڑی اشتہاری ایجنسیوں نے مل کر ایک مشترک دفتر قائم کیا تھا جو حکومت کی تمام اشتہاری مہموں کو چلاتا تھا۔ یہ ایجنسیاں یورپین تھیں، صرف ایک ایجنسی "ایڈارٹس لمیٹڈ" ہندوستانی تھی۔ یہاں میرے ایک عزیز کام کرتے تھے۔ واحد مسلمان۔ وہ ایک بہتر جگہ پر چلے گئے اور ان کی جگہ میں دھنس گیا۔ یہ جگہ میاں ارشد حسین نے مجھے دلوائی، ہمارے سابق وزیر خارجہ اور سینئر سفارت کار۔ وہ حکومت کے مشیر اشتہارات تھے۔ میاں صاحب سے مجھے ڈاکٹر تاثیر نے ملوا دیا تھا جن سے حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں ملاقات رہتی تھی۔ پھر انھوں نے کئی بار اپنے گھر پر بھی بلایا، نواب مشتاق احمد گورمانی سے بھی ملوایا۔ دونوں بہت قدردانی فرماتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر خوب آدمی تھے۔ صاحب علم بھی، صاحب دل بھی۔ انھوں نے میاں

صاحب سے میرا تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرایا تھا۔ انگریزی میں بولے کہ ان کی بعض تحریریں جو میں نے دیکھی ہیں اردو کے کسی بھی سینیئر رائٹر کے لیے کریڈٹ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ میاں صاحب بڑے صاف گو اور با اصول آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے کمپنی کے انگریز افسر کے پاس بھیجا اور کہا کہ میں انہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا مگر معتبر لوگوں نے ان کی تعریف کی ہے۔ ان کی آزمائش کر لیں، اور مجھ سے بھی کہا کہ آپ کو اپنے بل پر رہنا اور اپنے تقرر کا جواز پیدا کرنا ہوگا۔

یہاں میں پہلے مترجم تھا مگر پھر اوریجنل کاپی رائٹنگ بھی کرنے لگا۔ ابتدا میں ایک صاحب پیٹر جانسن سے سابقہ رہا۔ وہ تو مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے ہی رہے اور تیوری پر بل ہی ڈالے رکھے۔ غالباً میاں صاحب کا آدمی سمجھتے تھے، اور ان سے کچھ خوش نہیں تھے۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے کچھ فقرے میاں صاحب کی بابت میرے کانوں تک بھی پہنچے تھے، مگر میں نے لُتراپا نہیں کیا۔ وہ گئے تو ایک اور صاحب مسٹر ڈینس اسکاٹ آگئے، اور یہ واقعی بڑے سویٹ آدمی تھے۔ ایک دن میں دل کے ہاتھوں کچھ مجبور سا ہو کر بے اختیار بلا رخصت دلی جا پہنچا۔ شرما میرے رازدار تھے۔ انہوں نے کہا فکر نہ کرو، میں سنبھال لوں گا۔ مگر بھانڈا پھوٹ گیا۔ آدمی گھر پر گیا تو بتایا گیا کہ دہلی گئے ہیں۔ دفتر میں کھلبلی مچ گئی۔ میں دو دن بعد واپس آیا تو ہمارے رفقاءے کار متوقع تھے کہ یہ بے ضابطگی ضرور رنگ لائے گی۔ اسکاٹ صاحب کے سامنے پیشی ہوئی۔ لوگ بڑے اشتیاق سے جھانکتے رہے۔ میں نے آدھا اقرار کیا کہ کالکا تک گیا تھا، وہاں پھنس گیا۔ ٹرین چھوٹ گئی، ورنہ پیر کی صبح واپس آجاتا، ہفتے کو تو یہیں تھا۔ اگرچہ نہیں تھا۔ اسکاٹ صاحب نے بڑی ملائمت سے نصیحت فرمائی کہ تم یہاں تخلیقی کام کرتے ہو۔ میں تم پر کوئی بندش نہیں لگانا چاہتا۔ --- دل چاہے تو مال پر گشت لگاؤ یا کسی لائبریری میں جا بیٹھو، یا گھر ہی چلے جاؤ، مگر ہمیں ہر لمحے معلوم رہنا چاہیے کہ کہاں ہو تاکہ وقت پر بلایا جا سکے۔ بہت سے ساتھی جَل بھن کر رہ گئے۔

اسکاٹ صاحب کی بیوی پہلے مسز ووڈ تھیں۔ پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے مسز اسکاٹ بن گئیں۔ ووڈ صاحب بھی اپنی قسم کے ایک ہی آدمی تھے۔ ان سے مجھے بھائی احمد علی (پروفیسر احمد علی) نے ملوایا تھا کہ انہیں نوکری

دلواف۔ انہوں نے مجھے سیسل ہوٹل میں لنچ پر بلوا لیا جہاں ٹھہرے تھے اور تمام وقت سیاسی گفتگو کرتے رہے۔ میں حیران کہ یہ عجب انٹرویو ہے۔ بولے، "واٹ از یوئر پالیٹکس؟" میں نے کہا، "نل۔" بولے، یہ مہمل بات ہے۔ تم پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ یہ ووڈ صاحب وہ ہیں جو کہتے تھے کہ میں کبھی کبھی جاں کر کسی قلی کو ٹھوکر مار دیتا ہوں تا کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرے اور اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ بھی انگریز افراد کی جبری بھرتی کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے فلم ایڈوائزر ہو گئے تھے۔ افسر شاہی میں سے نہ تھے۔ ایک دن جوش میں آکر بمبئی میں چوپاٹی میدان کے ایک جلسے میں سرکار کے خلاف دھواں دھار تقریر کر دی، اور سنا ہے کہ فی الفور بذریعہ تار برطرف کیے گئے۔ انہوں نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کر لی اور وہ جو پہلے مسز ووڈ تھیں، مسز اسکاٹ بن گئیں۔ مگر رواداری دیکھیے کہ کچھ دن بعد ووڈ صاحب شملے آئے تو وہی سابقہ مسز ووڈ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے انہیں دفتر کا گشت کرا رہی تھیں۔ میرے پاس بھی لائیں۔ وہ مجھے پہچان گئے، مگر تیوری سے ظاہر تھا کہ ناپسندیدہ آدمی خیال کرتے ہیں۔ لنچ پر مجھ سے کہتے تھے بلا جھجھک گفتگو کرو۔ میں نے سمجھا کہ اس میں ضرور کوئی چال ہے۔ میں سیاست کے موضوع کو ٹالتا ہی رہا تھا۔

ہمارے جد صاحب بھی اگرچہ ادھر ادھر کی گفتگو کم ہی کرتے تھے لیکن ایک دفعہ اپنے گھر پر ترنک میں آکر بول پڑے کہ یہ انگریز بڑی ہی بدذات قوم ہے۔ تم ہندوستانیوں کے ساتھ تو اس کا جو سلوک ہے وہ ہے ہی، ہمارے ساتھ بھی کچھ کم تعصب نہیں۔ میں چونکہ ایک غریب کسان کا بیٹا ہوں، کسی لارڈ یا ایسکوائر کا نہیں، اس لیے یہ میری اوقات کپتان سے زیادہ نہیں سمجھتے، چاہے میں آسمان کے تارے توڑ لاؤں، طبقہ واری تعصب دور نہیں ہوگا۔ مگر ان اصحاب کے انہی اقوال سے انگریزوں کی طرف سے من حیث القوم ہمارا تعصب بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے۔ ان کے مدبرین نے ہماری حماقتوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا تو یہ ہماری قسمت کا پھیر تھا، ان میں بعض واقعی ایسے تھے جیسا کہ جد صاحب نے کہا، مگر ہم میں بھی کیسے کیسے نہیں ہو گزرے۔

انگلستان کے لوگوں میں اُس صاحبیت کی رمق بھی نہیں پائی جاتی جو یہاں بعض افسروں میں نظر آتی تھی، بلکہ کالے افسروں میں بھی۔ جد صاحب کا

کہنا ایک طرف، میں نے لندن میں یہ بھی دیکھا کہ وہی ویٹر جو ڈائننگ روم میں ہمارا کھانا لگاتا اور ہمارے اشاروں پر "یس سر، یس میڈم" کہتا ہوا دوڑتا تھا، شام کو یونیفارم اتارنے کے بعد انہی مہمانوں میں سے جو اس ہوٹل میں مقیم تھے، کسی لیڈی کی بغل میں ہاتھ ڈالے تفریح کو نکل جاتا تھا۔

میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ریاست جاوہر کے ولی عہد (جو ان کے شاگرد رہے تھے) لندن میں بڑے اشتیاق سے ایک سابق ریڈیڈنٹ بہادر کا پتہ ڈھونڈتے ہوئے گئے۔ ریڈیڈنٹ والیان ریاست کے لیے چھوٹا خداوند ہوتا تھا۔ دیکھا کہ ایک گلی میں ان کی میم صاحب گوشت ترکاری سے لدی پھندی ہانپتی کانپتی چلی آرہی ہیں۔ یہاں ان کی ایک آواز پر دس ملازم دوڑتے تھے، بلکہ پرنس شاید خود بھی دوڑ پڑتے۔ سرکاری حکام کا طنطنہ سبک دوشی کے بعد ویسے بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اترا شحہ مردک نام، پرانی مثل ہے۔

ایسوسی ایٹڈ اڈورٹائزنگ ایجنسیز، شملہ (AAA) میں ایک صاحب اور تھے مسٹر بروس ہے (Bruce Hay)، شملہ ڈرامیٹک کلب کی روح رواں اور بڑے اچھے ایکٹر۔ ہنری ہشتم کا پارٹ بہت اچھا کیا جس کی شملہ میں دھوم مچی۔ میں نے ان سے کہا کل جمعۃ الوداع ہے، میں چھٹی مناؤں گا۔ سارے دفتر میں واحد مسلمان تھا۔ بولے بالکل غلط۔ میں نے ایسے کسی جمعے کا نام آج تک نہیں سنا۔ میں نے انہیں قائل کرنا چاہا مگر وہ بڑے غصے میں ایک ایک سے یہی کہتے رہے کہ اس نے ایک نیا جمعہ نکالا ہے۔ جمعہ ٹول وڈا۔ انہوں نے مجھے چھٹی نہیں منانے دی۔ مجھے رخصت لینی پڑی۔

مانٹرنگ آفس میں میرے ایک ساتھی اور تھے جن کا احوال میں بطور افسانہ علیحدہ لکھ چکا ہوں ("صمد کی سچی کہانی"، مطبوعہ "افکار"، فروری ۱۹۷۹)، لہذا اسے یہاں نہیں دہراؤں گا۔ خلاصہ یہ کہ بڑے خوش رو نوجوان تھے اور ایک والی ریاست کے پاس ایک ایسی خدمت پر مامور رہ چکے تھے کہ حسینانِ جہاں کی طرف سے دل سیر ہو چکا تھا، اور اب اس کے ردِ عمل سے دوچار تھے۔

اسی دفتر میں ایک خاتون مسز بیرنگٹن بھی تھیں۔ ایک دن ان کے جوان لڑکے کی موت کی خبر آئی۔ لڑائی میں کام آگیا تھا۔ مسز بیرنگٹن اکیلے میں روئی ہوں تو روئی ہوں، کسی کے سامنے انہوں نے ایک آہ بھی منہ سے نہیں نکالی۔

ایک دن کی چھٹی بھی نہیں مٹائی۔ ہم سب اس صبر و تحمل پر حیران تھے۔ غلام عباس کے انتقال پر میں نے ان کی دوسری بیوی کرس سے گہرے رنج کا اظہار کیا۔ وہ بولیں جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ ان کی موت بڑی پرسکون تھی۔ اس سے آگے تو صرف بڑھاپے کی تکلیفیں ہی جھیلنا رہ گیا تھا۔ کرس یا زینب بڑی عمدہ خاتون اور بڑی اچھی بیوی تھیں۔ مگر ان لوگوں کا مزاج ہی یہ ہے۔ معقول، معتدل، حقیقت پسندانہ، بناوٹ اور مبالغے سے خالی۔ میرے بیٹے نے میرے بڑے بھائی کی بیٹی سے (جو فنش ماں کی اولاد ہیں) اپنے چچا کی موت پر اظہارِ غم کیا اور ان کی خوبیوں کو سراہا تو انہوں نے کہا آپ ان کے بارے میں بڑے جذباتی ہیں اور خوش طبعی کے ساتھ ایک بے لاگ سا تبصرہ ان کے کردار پر کر دیا۔ یوں کہنے کو تو مرزا غالب بھی کہہ گئے ہیں:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

اور یہ بھی کسی نے کہا ہے:

کس کس کو یاد کیجیے کس کس کو روئیے
آرام خوب چیز ہے منہ ڈھک کے سوئیے

مگر یہ سوال پھر بھی جواب کا محتاج رہ جاتا ہے کہ زندگی کے عیش کے ساتھ غم کو منانا بھی زندگی کی نشانی ہے یا محض فضول اور جی کا زیاں؟
ایجنسی میں میرے قریبی دوست ستیہ دیو شرما تھے۔ میں نے ان کو الف۔ ب۔ ت۔ سکھائی، انہوں نے مجھے ہندی حروف۔ بس یہاں سے چل کر انہوں نے اپنے شوق سے اردو پڑھی۔ "دیوانِ غالب"، "بانگِ درا"، وغیرہ ختم کر چکے تھے اور فارسی کا آغاز کر دیا تھا۔ پھر عربی سیکھنے والے تھے۔ کہتے تھے میں چند برس کمانے اور آئندہ گزارے کے لائق روپیہ بچانے کے بعد باقی ماندہ عمر مطالعے میں گزاروں گا اور قرآنِ اصل عربی میں پڑھوں گا۔ پھر ہم جدا ہو گئے اور معلوم نہیں کہ ان کا منصوبہ کہاں تک پورا ہو سکا۔ غالباً بڑھتی ہوئی افراطِ زر نے وہ

منزل نہ آنے دی جہاں وہ کمانے کے فکر سے یک سو ہو کر مطالعے میں لگ جاتے۔ نہایت ہوش مند، بڑے لائق، شریف، اور مخلص انسان تھے۔ ایک دن کہنے لگے میں آج تک اس بات پر حیران ہوں کہ آپ کے فلاں عزیز آپ کے اس دفتر میں آنے کے کیوں خلاف تھے۔ مجھ سے کہا کہ انہیں یہاں نہ آنے دو تو اچھا ہو۔ میں نے کہا، ہیں شرما جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہنے لگے آپ عجیب آدمی ہیں۔ میں پہلے بھی یہ بات آپ کو بتا چکا ہوں، اور اس وقت بھی آپ نے بالکل ایسے ہی کہا تھا کہ ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا حافظہ واقعی بعض باتوں میں بڑا خراب ہے اور اب تو ویسے ہی بہت خراب ہو گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو ناخوش گوار باتیں اب زیادہ چُہنے لگی ہیں جو پہلے نسیاً منسیا ہو جاتی تھیں۔ عملے کے قریبی دوستوں میں ایک شمشیر سنگھ نرولا بھی تھے، مشہور افسانہ نگار جنہوں نے میرے بچے کو "لال سلام" سکھایا تھا۔ وہاں ہر سال بڑا مشاعرہ بھی ہوتا تھا جس میں میں شریک ہوتا رہا۔ حکومت ہند کے بعض اونچے افسران مشاعروں میں تمغے بانٹتے تھے۔ ایک تمغے کا اعلان میرے لیے بھی ہوا جو مسٹر بی۔ ایل۔ نہرو (آئی۔ سی۔ ایس۔) کی طرف سے تھا۔ اور تو اور استادوں کے لیے بھی تمغے کا اعلان ہونے لگا۔ ایک تمغہ جناب ثاقب لکھنوی کو بھی پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے فرمایا، بھئی میں تمغے کا کیا کروں گا۔ مجھے کوئی فاؤنٹین پین دلا دو۔ انہیں پارکر کا سیٹ پیش کر دیا گیا۔ بات تو انہوں نے معقول ہی کہی تھی، مگر میں نے شاعروں میں چہ می گوئیاں سُنیں، کہ کیا ہو گیا ہے ثاقب صاحب کو، خود ہی منہ پھوڑ کر فاؤنٹین پین مانگتے ہیں۔ دراصل غیبت ہمارا مرغوب پاس ٹائم ہے، اس کے لیے کوئی بھی بہانہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ایک دوست فرمایا کرتے تھے کہ آؤ بھئی کوئی غیبت چھیرو۔ بہت دن سے نہیں ہوئی۔

میری ڈیوٹی رات کی ہوتی تھی اور دن خالی۔ میرے علی گڑھ کے دوست رشید مودودی، جو جانثار اختر اور مجاز کے گھرے ساتھی تھے، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے پسندیدہ شاگرد، ان کا بھی دن خالی ہوتا تھا۔ ہم دونوں اکثر ہانکنگ کے لیے نکل جاتے اور لمبے لمبے دھاوے مارتے۔ ایک گاؤں کے ایک گھر میں شاید دم لینے اور پانی پینے کے سلسلے میں کچھ ربط ضبط ہو گیا۔ لڑکا شملے میں چپراسی گیری کرتا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ ملاقات تو ہماری

تینوں سے تھی، مگر وہ نہ بھی ہوتا تو دونوں سوکنیں آؤ بھگت سے نہیں کتراتی تھیں۔ دونوں آپس میں سہیلیاں اور خاصی خوش طبع تھیں۔ ہم نے ان کی تصویریں بھی کھینچی تھیں جو اب بھی کہیں موجود ہیں۔ ہماری ملاقات بالکل مخلصانہ تھی، مگر دنیا کو خلوص کہاں پسند آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک دن گاؤں والے آئے دن کی آرجار دیکھ کے پیچھے لگ گئے، اور ہم جان بچا کے واپس آئے۔ کچھ لوگوں نے پہاڑی پر کھڑے ہوئے دور ہی سے للکارا اور دھمکی دی، بارے پیچھا نہیں کیا۔

رشید صاحب علی گڑھ کے گرینڈی ہیں اور بڑے پیارے آدمی، ان کے بھانجے بھانجیاں تو ان کو کہتے ہی پیارے ماموں ہیں۔ شملے ہی سے ایسٹرن گروپ سپلائی کاؤنسل میں ہو کر ایران چلے گئے۔ یہ کاؤنسل اتحادیوں کی طرف سے فوجی سامان ایران کے راستے روس کو پہنچاتی تھی۔ رشید نے وہیں شادی کی اور برسوں پردیس ہی میں رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بڑے شوخ چپ، شیر، اور گربہ مسکینی میں طاق تھے؛ اسی لیے ایک طرف یونیورسٹی کے حکام اعلیٰ کے محبوب تھے تو دوسری طرف شیروں میں شامل۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد کچھ دن وارڈن بھی رہے۔ ان کی ایک خصوصیت خاصہ "بور پالنا" تھا۔ کہتے تھے بوریت کو برداشت کرلو تو بوروں سے دوستی بڑی مفید رہتی ہے اور یہ مخلوق وقت پر بہت کام آتی ہے۔ آپ شکار پر جا رہے ہیں، دو بور ساتھ ہیں۔ یاد آیا کہ کارتوسوں کی پیٹی یا توشہ دان یا چاقو تو پیچھے ہی رہ گیا۔ ایک بور کو دوڑا دیا، وہ مارے خلوص کے دوڑ پڑا۔ رشید صاحب نے مولانا نیاز فتح پوری کو بھی ہمالیہ کی ترائی میں بہت شکار کھلایا ہے۔ وہ بھی ان کے چاہنے والوں میں تھے اور ان کے پاس بھی نیاز صاحب کی بابت ایک دلچسپ مضمون کے لیے بہت مسالہ ہے، بشرطیکہ لکھیں۔

جنگ کے خاتمے پر شملے کی اشتہاری ایجنسی جو سب ایجنسیوں کے اشتراک سے بنی تھی، بند ہو گئی تو میں پھر بیکار ہو گیا۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک مکان بیچ کر رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا کہ شاید اشتہاری ایجنسیوں سے مدد ملے۔ بھائی صاحب لندن میں تھے، انھوں نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔ یہ مکان دہلی میں سرسید روڈ کے قریب کوچہ تارا چند میں تھا۔ اس کی بابت مشہور ہو گیا تھا کہ اس میں جن رہتا ہے۔ کئی برس خالی پڑا

رہا، پھر شاید وہ جن کہیں اور چلا گیا۔ دو منزلہ مکان تھا۔ سولہ ہزار میں بکا۔ دو ہزار بھائی صاحب کو بھجوا دیے، باقی سے رسالہ نکالنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نام "روزگار" رکھا تھا کہ سارا قصہ روزگار ہی کا تھا۔ ہمارے ہاں نوکری اور مزدوری کو روزگار کہتے تھے۔ بزنس کو دھندا یا کاروبار، اب جاب اور بزنس ہی چلتا ہے۔ زبان کا گلا یوں ہی گھونٹا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہم اپنے ہاتھوں سے گھونٹ رہے ہیں۔ اتنے میں کلکتہ سے تار آیا کہ فوراً پہنچو۔ یہ تار میاں ارشد حسین صاحب نے دلویا تھا۔ وہ امپریل ٹوبیکو کمپنی میں واپس پہنچ گئے تھے جہاں سے ڈیپوٹیشن پر حکومت ہند میں آئے ہوئے تھے۔ وہ کمپنی کی مملوکہ جنرل ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے جنرل مینجر تھے، مگر اس سے پہلے کہ میں کلکتہ پہنچوں، وہ پھر حکومت میں اپنے اسی عہدے پر جاچکے تھے۔ ان کی جگہ مسٹر فریڈرک اسپینس کام کر رہے تھے۔ ان کو بھی شملے سے جانتا تھا۔ وہ بڑے عمدہ آدمی تھے۔ انہوں نے میری بڑی مدد کرنی چاہی، مگر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ وہ بھی بددل ہوئے اور میں بھی۔ میاں صاحب نے مجھے کمپنی کا کوئے نیٹڈ گریڈ دلانے کے لیے بلایا تھا۔ ان دنوں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور کمپنی چاہتی تھی کہ اس کے بڑے بھاری عملے میں کوئی مسلمان بھی نظر آئے۔ لیکن جوں جوں تقسیم سامنے نظر آتی گئی، کمپنی کے تیور بدلتے گئے۔ یہ بات مجھے خود اسپینس صاحب نے اشاروں کنایوں میں بتائی اور کہا کہ میں یہاں تمہارے لیے ترقی کا کوئی موقع نہیں دیکھتا۔ تم رخصت لے کر پاکستان چلے جاؤ، اس نئے ملک کو پڑھے لکھے ذہین لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ شاید ہم بھی اپنا کوئی دفتر وہاں کھولیں۔ جنرل ایڈورٹائزنگ کو بعد میں امریکی کمپنی گرانٹ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا تھا، کیونکہ ہندوستان کے میڈیا اس پر معترض تھے کہ کوئی مشترکہ کمپنی اپنی ایجنسی کھول کر بالواسطہ کمیشن وصول کرے جو صرف ایجنسیوں کا حق ہے۔ جنگ کے بعد گرانٹ کا دفتر یہاں کھلا تو اسپینس صاحب نے سب سے پہلے مجھی سے رابطہ قائم کیا، مگر میں اس وقت برٹش انفارمیشن میں کام کر رہا تھا۔ پانچ سو روپے اس زمانے میں اچھی تنخواہ تھی۔ میں نے سوچا نئی ایجنسی کے لیے بزنس حاصل کرنا درد سر ہوگا۔ پھر مجھے پبلک سروس کمیشن نے حکومت پاکستان میں افسر اشتہارات کی جگہ کے لیے منتخب کر لیا۔

(بشکریہ، "افکار"، جنوری ۱۹۸۳، صفحہ ۱۷ تا ۲۵)

(مسز جین حق کے ہند انگریزی ناول)

فی الحال سخن ورزیوں کے تذکرے میں کچھ وقفہ غالباً ناظرین کو گوارا ہوگا جس میں ابھی کچھ اصناف کا تعارف باقی ہے، اور غزل بھی پُرسش کا تقاضا کر رہی ہے جس کا میں نے ساری عمر کی طرح اس خودنوشت میں بھی اب تک گلا دبائے رکھا ہے۔ یہ خود بھی میرے کہنے پر کب آتی تھی، اپنی مرضی کی مختار رہی ہے۔

میں نے بچپن میں ایک کتاب دیکھی تھی ABDULLAH AND HIS TWO STRINGS ، مگر میں اُس وقت اسے پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ پھر وہ کتاب بھی کہیں گم ہوگئی، مگر اس کا عنوان اور مصنفہ مسز جین حق کا نام میرے ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ بلکہ دل پر لکھا تھا۔ ۱۹۶۵ میں جب میں ایک ٹریننگ کورس پر انگلستان گیا تو مجھے رالف رسل صاحب کی مہربانی سے برٹش میوزیم لائبریری میں داخلے کا اجازت نامہ مل گیا تھا۔ برٹش میوزیم میں تو کوئی بھی ٹکٹ لے کر داخل ہوسکتا ہے۔ لائبریری میں داخلہ عام نہیں۔ اس سے پہلے میں نے ترقی اردو بورڈ کے لیے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری سے کوئی چالیس مخطوطات کی عکسی نقلیں منگوائی تھیں۔ وہ لوگ خوشی سے بھیج دیتے اور ہم اس کے واجبی دام یہیں برٹش ہائی کمیشن کو ادا کردیتے تھے۔ اس کے بعد خود ہماری ہی حکومت نے یہ سلسلہ رکوا دیا۔ ہائی کمیشن نے معذرت کرلی کہ حکومت پاکستان نے اس کارروائی کو بے ضابطہ قرار دیا ہے اور ہم آپ کی فرمائشوں کی مزید تعمیل سے معذور ہیں۔ افسر شاہی کی عادت ہے کہ چلتے ہوئے کام میں آڑنگا لگائے۔ اس کے علاوہ اس عمل پر بندش کا کوئی سبب نہ تھا، جس میں بیرونی زر مبادلہ کی بھی بچت تھی اور کتابیں سیدھے سبھاؤ آرہی تھیں۔

اس سے پہلے تقسیم کے وقت پارٹیشن کاؤنسل کے سامنے یہ مسئلہ بھی آیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے مرکزی اہتمام میں جو کتب خانے تھے، وہ بھی تقسیم ہونے چاہئیں۔ ان میں خاص طور پر کلکتے کی امپیریل لائبریری شامل

تھی، جو ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔ اس کے علاوہ دہلی کی امپیریل سکریٹریٹ لائبریری، مختلف محکموں کے اپنے کتب خانے، فوجی اہتمام میں چلنے والے کتب خانے، اور کئی اور اہم کتب خانے بھی۔ اس وقت کچھ اہل قلم حضرات نے اصحابِ حکومت کو توجہ دلائی کہ کتابیں بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان میں پاکستان کو اپنا حصہ وصول کرنا چاہیے۔ اس پر ایک بہت اونچے آدمی نے کہا کہ میاں رہنے دو، یہاں کروڑوں کے معاملات اٹکے پڑے ہیں، تم کتابوں کو لیے پھرتے ہو۔ بہر حال، یہ مان لیا گیا کہ کتابیں بھی تقسیم ہوں گی۔ اس پر ہندوستان نے اپنی طرف سے یہ شرط لگائی کہ صرف وہ کتابیں پاکستان کو دی جاسکیں گی جن کی دو جلدیں موجود ہوں گی۔ پاکستان نے یہ شرط بلا تامل منظور کر لی۔ پھر ان ڈیپلیکیٹ کتابوں کی وصولی کے لیے ہمارے بعض خاصے سینئر افسر برسوں وہاں مقیم رہے۔ آغا اشرف مرحوم اس سلسلے میں دہلی میں تعینات رہے تھے اور قاضی محمد منیر بھی۔ مقصد یہ تھا کہ مقامی عملے کے تعاون سے کتب خانوں کے کیٹلاگوں کا مقابلہ کر کے ڈیپلیکیٹ یا مشنی تلاش کریں۔ اس سے وہ ایڈیشن مراد لیے گئے جو ایک ہی سال کے ہوں۔ دوسرا یا تیسرا ایڈیشن اگر ہوگا تو ڈیپلیکیٹ شمار نہیں نہ ہوگا۔ مگر مقابلے اور قابل انتقال کتابوں کی فہرست سازی کا کام تکمیل کو نہ پہنچا۔ بالآخر حکومت پاکستان نے اس کام کے لیے ہندوستان میں خصوصی افسر کا تقرر بند کر دیا اور معاملہ گاؤ خورد ہوا۔

ایک فیصلہ انڈیا آفس کے ذخیرے کی بابت بھی طے پایا تھا۔ برطانوی حکومت نے فراخدلی سے پیشکش کی تھی کہ ہندوستان یا پاکستان کو اس میں سے جس چیز کی ضرورت ہوگی، اس کی عکسی نقلیں مہیا کر دی جائیں گی۔ لیکن انڈیا آفس کی الغاروں مطبوعات، کتابیں، رسالے، وغیرہ وغیرہ، مرتب صورت میں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سنہ وار بندل بندھے رکھے ہیں۔ قانون یہ تھا کہ ہندوستان میں جو کتاب چھپے گی اس کی ایک نقل انڈیا آفس کو ضرور بھیجی جائے گی۔ چنانچہ سال بہ سال وصول ہونے والی مطبوعات کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں جنہیں مرتب کرنے کے لیے بڑا وقت اور عملہ درکار ہے۔ حکومت نے ان ذخائر کے جائزے اور ابتدائے کار کے لیے ایک سینئر افسر کا تقرر منظور کیا مگر کارروائی آگے نہ بڑھی۔ اس کے طفیل صرف اتنا ہوا کہ قدرت اللہ شہاب صاحب وہاں

تعیّنات ہوئے تو ان کی بیگم کو وہاں کا علاج میسر آسکا۔ پھر ابنِ انشا کو بھی اسی عہدے پر تعینات کیا گیا تو ان کا علاج ہو سکا۔ افسوس افسوس کہ جاں بر نہ ہوئے۔ ان کا داغ اردو کے دل پر آج بھی تازہ ہے۔

ایک قانون یہاں بھی بنا ہے کہ جو کتاب چھپے گی اس کی ایک جلد نیشنل لائبریری، اسلام آباد، کو ضرور بھیجی جائے گی۔ معلوم نہیں اس پر کس حد تک عمل ہو رہا ہے۔ علم کے معاملے میں ہمارا قومی اسوہ صدیوں سے کچھ اور رہا ہے: "علموں بس کریں او یار۔"

کاش شخصی کردار ہی اس مرتبے پر ہوتا جو ان صوفیا کے مدّ نظر رہا ہوگا اور جس کی مثال انہوں نے اپنی ذات سے پیش کی۔ یعنی پاک بازی و بے نیازی۔ اس دنیا میں تو دنیا داری بھی علم کے بغیر نہیں چل سکتی۔ لیکن یہاں یہ نکتہ

لائقِ اظہار ہے، جو افسوس کہ ہماری علمی سرگرمیوں سے غائب ہے، یعنی علم بھی دین کی طرح شرک کا روادار نہیں۔ علم کو علم کی خاطر حاصل کیا جائے تبھی تحصیلِ علم کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اس ذوقِ بے پروا کے بغیر نہ علم کی خدمت کی جا سکتی ہے، نہ علم سے خدمت لی جا سکتی ہے۔

لندن میں اپنی ٹریننگ کے ٹائٹ یا کسے ہوئے پروگرام اور سیر سپائے کے درمیان کچھ وقت نکال کر میں برٹش میوزیم میں بیٹھتا رہا۔ اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی کتابوں کے مخطوطات بھی نکلوا کر دیکھے۔ بے نا بوالعجبی۔ بھلا انگریزوں کو "اشعة اللغات مدارج النبوة" "جذب القلوب الی دیار المحبوب"، اور "سفر السعادة" جیسی مسلمانوں کی عربی فارسی میں لکھی ہوئی دینی کتابوں سے کیا واسطہ تھا کہ انہیں ذوقِ شوق سے جمع کیا اور اتنے اہتمام سے سینت کر رکھا، جنہیں ہم خود کیڑوں کی نذر کرچکے تھے۔ ہم ایسے کارِ فضول میں کم ہی پڑتے ہیں۔ ---

برٹش میوزیم کے کتب خانے میں مجھے مسز جین حق کے تین ناول مل گئے۔ مگر یہ ذکر تو رہا ہی جاتا ہے کہ موصوفہ کون تھیں اور مجھے ان کے ناولوں سے کیوں دلچسپی تھی۔ دلچسپی کیوں نہ ہوتی۔ وہ میری نانی جو تھیں۔ میرے نانا ڈاکٹر مشرف الحق (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی دوسری بیوی، جنہوں نے اپنے یورپ کے بارہ سالہ دورانِ قیام میں ان سے شادی کر لی تھی۔ ڈاکٹر مشرف الحق میرے نانا تھے اور خود مولوی نذیر احمد کے نواسے۔ صغریٰ بیگم کے بڑے بیٹے جن کے

مطالعے کے لیے "مراۃ العروس" لکھی گئی تھی جو اردو کلاسک بن گئی۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد آج تک ڈپٹی نذیر احمد کہلاتے ہیں، حالانکہ ڈپٹی کلکٹر تو کبھی رہے تھے۔ بعد میں حیدرآباد میں معتمد مالیات ہو گئے تھے۔ ان کی علمی خدمات، خصوصاً تعزیرات ہند مرتب کر نے پر آکسفورڈ یونیورسٹی نے انہیں ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی اعزازی ڈگری بھی دی تھی۔

میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ان ناولوں کو بالاستیعاب پڑھ سکتا۔ کراچی میں مشفق خواجہ صاحب کے پاس ایک پاکستانی صاحب سے ملاقات ہوئی جو برٹش میوزیم لائبریری میں کسی خدمت پر تھے اور مستقل عملے میں شامل۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ مجھے ان ناولوں کی نقلیں بھجوا دیں گے۔ میں نے وقفے وقفے سے کئی بار انہیں یاد دہانی کرائی۔ میرے بعض دوست اور عزیز جو لندن جاتے رہتے تھے انہوں نے بھی نقلوں کے دام دینے کے لیے کہا۔ میرے بیٹے بھی ان سے ملے۔ انہوں نے کہا ان سے کہیے کہ تحریری درخواست بھیجیں۔ میں نے وہ بھی اپنے بیٹے کے ہاتھ بھجوا دی، تو بولے کہ میں خود پاکستان آ رہا ہوں۔ اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ وہ آئے بھی مگر مجھے نقلیں نہ ملیں۔ آخر میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے مسٹر چارلس لوئس سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا یہ کیا مشکل بات ہے۔ میں ضرور نقلیں بھجوا دوں گا۔ اور انہوں نے بودلین لائبریری آکسفورڈ سے نقلیں تیار کرا کے بھجوا دیں۔ میں نے ان کو دام ادا کر دیے۔ تین ناول تھے جو مجھے کوئی ڈھائی ہزار روپے میں پڑے۔ وہاں اجرتیں یہاں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہیں۔

موصوفہ نے غالباً تین ہی ناول لکھے ہیں۔ برٹش میوزیم میں بھی یہی تین ناول تھے: (۱) ABDULLAH AND HIS TWO STRINGS (لندن: ہرسٹ اینڈ بلیک، ۱۹۲۷)، (۲) THE BRIDAL CREEPER (لندن: ہرسٹ اینڈ بلیک، ۱۹۲۸)، اور (۳) THE END OF MARRIAGE (لندن: اینڈریو میلرز، ۱۹۳۵)۔

آخری دو ناول ہندوستان میں بودوباش رکھنے والی برطانوی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں جس میں فوجی اور سول افسران، تاجر اور پیشہ ور لوگوں کی معاشرت، آپس کے روابط، کلب لائف، وغیرہ کا احوال ملتا ہے۔ کہانی میں رومان کی چاشنی بھی موجود ہے۔ کردار نگاری میں نفسیاتی ژرف بینی سے کام لیا ہے۔ مثلاً، آخری کہانی میں برطانیہ کی ایک دیہاتی لڑکی اپنے گاؤں سے نکل کر

سیدھی ہندوستان پہنچتی ہے۔ لڑکی حسین تھی۔ اس سے اسی علاقے کے ایک اعلیٰ خاندان کے رئیس زادے کو دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ اسے بیاہ کر ہندوستان لے آیا جہاں اسے فوجی کمیشن مل گیا تھا۔ اس بے جوڑ شادی کی مخالفت لڑکی اور لڑکے دونوں کے خاندان والوں کی طرف سے ہوئی۔ یہاں انگلستان میں ذات پات یا طبقاتی تفریق کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یادش بخیر، کپتان جڈ صاحب کہا کہتے تھے کہ یہ انگریز تم ہندوستانیوں کو کیا حقیر سمجھے گا جیسا خود ہمیں سمجھتا ہے، کیونکہ ہم اعلیٰ طبقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ دیہات سے اٹھے ہوئے معمولی کسان ہیں۔ میں نے تیس برس فوجی خدمت کی اور اردو زبان میں خصوصیت حاصل کی (جس کا ذکر اس خود نوشت کے پچھلے سلسلے میں آچکا ہے)، لیکن میں آسمان سے تارے بھی توڑ لاؤں تو ان کی نظر میں حقیر ہی رہوں گا۔ انہوں نے اپنے خیال میں مجھے کپتانی بخش کر بڑی معراج دے دی ہے کیونکہ میں پرائیویٹ بھرتی ہوا تھا، یعنی پیادہ، مجھے اپنی کھال میں رہنا چاہیے۔ جڈ صاحب محاورات کے رسیا تھے اور بڑے صاف گو انسان۔ چلتے چلتے ان کا ایک لطیفہ اور سن لیجیے۔ ایسے ہی کچھ پہلے بھی گزر چکے ہیں۔

عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ جرمن فوجیں دہادب بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ فرانس زیر ہو چکا تھا۔ ان دنوں جڈ صاحب ایک شملے کے اسٹور میں کچھ خریدنے گئے۔ وہاں کچھ ہندوستانی باتیں کر رہے تھے کہ سنا ہے ولایت سے کوئی مشن آرہا ہے ہندوستان کے لیڈروں سے بات چیت کے لیے۔ ان سالوں کی ٹانٹ پر جوتے پڑے تو اب انہیں بات چیت کی سوجھی، وغیرہ وغیرہ۔ جڈ صاحب کو انہوں نے گوری چمڑی والا دیکھ کر نظر انداز کیا کہ یہ ہماری بات کیا سمجھے گا، اور جڈ صاحب چپکے سنتے رہے۔ چلتے وقت ان سے صرف اتنا کہا، "دیکھو یوں نہیں، یوں بولتے ہیں کہ جب ٹانٹ لگی پھٹے، خیرات لگی بٹے۔" ٹانٹ کی جگہ انہوں نے ایک اور ہی لفظ بولا تھا اور بولتے ہی چل پڑے۔ سننے والے پہلے تو سناتے میں آگئے، پھر زور کا قہقہہ لگایا تاکہ یہ بھی سن لیں۔ اگلے دن دفتر میں یہ واقعہ سنایا۔ مطلب عوامی روزمرہ کی داد چاہنا تھا۔ میرا خیال ہے جڈ صاحب مزاجاً اور طبیعتاً بھی دیسی آدمی ہو گئے تھے۔ کسی مضمون میں ڈوب جانا اور اسی کا ہو کر رہ جانا اسی کو کہتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی اور

ہندوستانیوں کو گلے لگا لیا تھا۔ شہرت سے اتنے بے پروا کہ آج دنیا ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ان کی محاورات اور مغلفات کی بیاضیں بھی ناپید ہیں۔ رالف رسل صاحب انہیں جانتے تھے اور میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ تلاش کرائیں۔ لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید کبھی کہیں سے نکل پڑیں۔

میں جڈ صاحب کا ذکر اپنی ایک کہانی میں بھی لے آیا ہوں ("خیرو کباری") جو میرے مجموعے "شاخسانے" میں شامل ہے۔ یہ اس لحاظ سے شاید کچھ نئی سمجھی جائے کہ دراصل کسی انسانی کردار سے زیادہ ایک کتاب کا افسانہ ہے، اگرچہ اس میں بعض دوسرے کرداروں کے ساتھ ایک بیگم کا المیہ کردار بھی ہے جنہوں نے اپنی بیوگی کے چالیس برس اثاث البیت بیچ بیچ کر کائے تھے اور نوبت کتابوں کے صندوق تک آ پہنچی تھی، جسے دل پر پتھر رکھ کر کھولنا پڑا۔ یہ خاندانی یادگار تھیں اور شوہر کو جان سے زیادہ عزیز رہی تھیں۔ ان میں سے ایک مخطوطہ ایک انگریز چوک سے خرید کر انگلستان لے جاتا ہے (یہ کہانی میں جڈ صاحب ہیں)۔ کتاب محفوظ تو ہو گئی مگر آج تک چھپنے نہیں پائی۔ یہی اس کا المیہ ہے؛ اور یہ کوئی فرضی کتاب نہیں، ایک مشہور مصنف کا شاہکار ہے جو اب بھی وہاں موجود اور یہاں ناپید ہے۔ گویا سچی کہانی۔

جین حق کا ناول "عبد اللہ اور اس کے دو گلے کے بار" بڑی حد تک اور بنیادی طور پر آٹوبیوگرافیکل ہے، اور اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر کہ اس میں ہندوستانی معاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ خاندان جسے متعارف کرایا ہمارا ہی خاندان لگتا ہے، اور کچھ کردار تو صاف پہچانے جاتے ہیں۔ دلی کے ایک مسلمان خاندان کا نوجوان لڑکا اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جاتا ہے اور وہاں ایک سکاپستانی لڑکی (ڈوروتھی) کے دام محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، جو اس کی اپنی لینڈ لیڈی کی لڑکی ہے۔ چنانچہ دونوں کو ایک دوسرے سے براہ راست شناسائی حاصل کرنے کا پورا موقع بھی ملا۔ وہ اسے خاص کریٹکل نظر سے دیکھتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ اس کی وجاہت، شائستگی، خلوص طبیعت اور شیفتگی کو دیکھ کر خود بھی اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ اپنے منکیتر سے منگنی توڑ کر اس کے آغوش میں آجاتی ہے اور والدین کی مخالفت کے باوجود سول میرج کر بیٹھتی ہے۔ والدین ہمارے دیسی والدین نہیں تھے۔ وہ بھی آخری دن اس کی مرضی کے آگے جھک جاتے ہیں۔ جب یہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے لندن روانہ ہوتے ہیں تو باپ اپنا غصہ تھوک کر ان سے اسٹیشن پر آکر ملتا ہے

اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتا ہے۔ لڑکے سے کہتا ہے کہ یہ میری ایک بی بی ہے اور مجھے بہت پیاری ہے۔ اسے خوش رکھنا۔

لڑکے کے دو دوست، ایک ہندو ایک مسلمان، لڑکے کے گھر اس خفیہ شادی کی اطلاع کر دیتے ہیں اور وہاں کھرام مچ جاتا ہے، خصوصاً اس لیے کہ عبداللہ کے گلے کا ایک بار اور ایک شیرخوار بچی وہاں بھی موجود ہے۔ (بچی گویا میری

والدہ ہوئیں۔ مگر جین صاحب نے ناول میں انہیں قبل از وقت ماردیا، کیونکہ کہانی میں عبداللہ کا ناتا اس کے گھرانے سے بالکل تڑوا دینا مقصود تھا، اور شاید ہندوستان میں ڈاکٹری علاج سے پرییز کے باعث ہلاکتِ اطفال کے مسئلے کو بھی جتنا چاہا ہو۔) لڑکے کے والد اس کا الاؤنس بند کر دیتے ہیں اور ٹکٹ بھیج کر واپس بلا لیتے ہیں۔ یہاں مشکل حالات کا سامنا رہتا ہے۔ نوکری تلاش کرتے ہیں۔ نہیں ملتی۔ کلکتے میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا ہے۔ آخر جب باپ کا انتقال ہو جاتا ہے تو یہ ان کے اکلوتے بیٹے اپنی اکلوتی بہن کے ساتھ جائیداد کا بٹوارہ کر کے اور بیچ باچ کر ولایتی بیوی کے پاس کلکتے چلے جاتے ہیں۔

کہانی تو ظاہر و باہر طور پر جین کی اپنی ہے، لیکن انہوں نے واقعات میں لامحالہ بہت سے تصرف بھی کیے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ اس قسم کے رشتے سے پیدا ہونے والے مسائل زیادہ واضح اور ترشی ترشائی صورت میں سامنے آجائیں۔ مثلاً کہانی میں ہے کہ والد محمد علی خان نے حویلی میں میم صاحب کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ وہ جب دہلی آئیں ہوٹل میں ٹھہریں اور وہیں سے کلکتے واپس چلی گئیں۔ خاندان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ خود جین کا داخلہ کبھی بند نہیں ہوا تھا۔ ان کے خسر خان بہادر شرف الحق صاحب کہانی کے محمد علی خان کے برعکس، بڑے حلیم الطبع آدمی تھے۔ میرے والد اور والدہ کی شادی کے گروپ فوٹو میں جین دولہا یعنی اپنے سوتیلے داماد کے برابر میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی اگرچہ ڈاکٹر شرف الحق صاحب گھر سے دور زیادہ تر ڈھاکے میں رہے جہاں وہ عربی فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور وہیں ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کیا، لیکن دہلی یا حیدرآباد دکن میں والدین، بھائی بہنوں اور عزیزوں سے ملنے آتے جاتے رہے تھے اور میم صاحب ساتھ ہوتی تھیں۔ ناول میں جو ہندوستانی گھر اور کرداروں کے نقشے ہیں وہ بھی اسی کے شاہد ہیں کہ یہ ماحول ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔

ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ دوسری شادی کی اطلاع ملنے پر پہلی بیوی یعنی میری سکی نانی سسرال سے اپنے میکے میں جا بیٹھی تھیں۔ بچی کو دادا دادی نے نہیں جانے دیا تھا۔ مگر ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جلد ہی باضابطہ علیحدگی عمل میں آ گئی اور میری نانی فردوسی بیگم کی بھی دوسری جگہ شادی کرادی گئی، جہاں ان کو بڑے اچھے چاہنے والے شوہر ملے۔ خان صاحب سید عبدالعزیز حقیقت میں بڑے محبت والے اور صاحبِ عزت و حیثیت انسان تھے۔ خاص طور پر میرے بڑے بھائی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کا ذکر کبھی آگے آئے گا۔

میرے خیال میں جین حق نے یہ ناول بڑے سیدھے سادے اور موثر انداز میں بڑی لیاقت، فراست اور دیانت سے لکھا ہے۔ اس کی شہادت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ گو یہ ان کی اپنی سرنوشت ہے (ڈوروتھی ان کا ہی افسانوی روپ تھی) اور عبداللہ گویا ان کے شوہر کا مثنیٰ، لیکن ناول ختم کرتے کرتے آپ دونوں سے سخت نفرت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جین کی نظر میں ایسے رشتوں کی

کچھ اور مثالیں بھی ضرور ہوں گی۔ انہوں نے اس ناول کے ذریعے گویا ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو پوری طرح روشنی میں لانا چاہا ہے۔ وہ ڈوروتھی کی انانیت، کمینگی، خود غرضی پر کوئی پردہ نہیں ڈالتیں۔ وہ عین اس وقت جب کہ شوہر اپنی بچی کو دفنانے کے لیے جا رہا ہے، اسے ایسے کچوکے دیتی ہے، اور اسے آزار پہنچانے کے لیے ایسے سامان کرتی ہے کہ کوئی اس جیسی بے دید و بے حس عورت ہی کر سکتی ہے۔ یہ مصنفانہ دیانت داری اور اصلیت نگاری خاصی حیرت انگیز ہے۔ مصنف کی حیثیت میں وہ اس سے کہیں اونچے درجے پر ہیں جہاں ایک نویباہتا نوجوان یورپی لڑکی کی حیثیت سے رہی ہوں گی۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ خود کو ملامت کے لیے پیش کرتی ہیں۔ (سلمیٰ کا کہنا ہے کہ جین حق کے ناولوں میں منظر نگاری اور اس میں دلی کیفیات کا عکس شامل کرنا خاص طور پر قابلِ داد ہے۔)

ڈوروتھی کو غصہ اس بات پر تھا کہ اس شخص نے مجھ سے جھوٹ بولا اور یہ ایک ایسی غلط فہمی پر مبنی تھا جسے comedy of idioms کہنا چاہیے۔ عبداللہ نے کہا تھا کہ میری شادی ایک ایسی لڑکی سے کرادی گئی جسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے تمہارے سوا کسی سے صحیح معنی میں

محبت نہیں کی۔ اب محبت یا love affair کے معنی ہمارے محاورے میں اور ان کے روزمرہ میں کچھ اور ہیں۔ (خصوصاً میک لو کے۔) یہ بات ایک اور واقعے کے ذریعے واضح ہو سکے گی:

میرے ایک دوست جن کا چند برس پہلے یہیں کراچی میں انتقال ہوا، علی گڑھ سے آنرز کر کے لندن مزید تعلیم کے لیے گئے تھے۔ واپس آئے تو پانی کے جہاز سے ایک لڑکی ان کے ساتھ لگ گئی اور وہ بھی اتفاق سے سکاج تھی۔ حسین، پڑھی لکھی، انگریزی میں آنرز کیے ہوئے۔ یہ دونوں دہلی بھی آئے اور چند روز ووڈلینڈ ہوٹل میں ٹھہرے، جو کشمیری دروازے کے باہر سیسل، میڈن، وغیرہ کے بعد آخری ہوٹل تھا۔ خاصی رومان پرور جگہ۔ ہوٹل والوں کو ان کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے پر اعتراض تھا۔ لہٰذا دو کمرے الگ الگ لیے گئے۔ اُس معاشرے میں یہ لازمی نہیں کہ لڑکا ہی سارا خرچ اٹھائے، اور یہاں تو چھری خربوزے پر گری تھی۔ چنانچہ وہ ان سے کچھ زیادہ ہی خرچ کرتی تھی۔ میں ان سے روز ہی ملنے جاتا رہا، اور ہم نے سیر سپاٹے میں بہت سا وقت ساتھ گزارا۔ گوشتھ سچ مچ گلے گلے ان کی محبت میں مبتلا تھی۔ وہ اپنی راز و نیاز کی باتیں بھی مجھے بتا دیتے تھے۔ ایک دن کہا، کل مجھ سے بہت خفا رہی۔ میں نے پوچھا، بات کیا ہے؟ بولی تم مجھے پیار تو کرتے ہی نہیں۔ کیا تمہیں میرے منہ سے بو آتی ہے؟ وہ بتاتے تھے کہ ایک دن ابّا کے ایک دوست نے ان سے پوچھا، صاحبزادے آجکل کیا کر رہے ہیں۔ وہ بھی ایک خوش طبع آدمی تھے۔ بولے، انگریزی میں بتاؤں یا اردو میں؟ انگریزی میں پوچھو تو love، اردو میں پوچھو تو حرام کاری۔

یہ تھا دونوں زبانوں کے روزمرہ کا فرق جسے ڈورر تھی نہیں سمجھی تھی۔